کلن چلانے والے سر سے پاؤں تک کالے ہو رہے تھے۔ دو گھنٹے ہوئے اسی کلن کے پلیٹ فارم پر جمع ہو کر ان سب نے رات کا کھانا کھایا تھا جو کینٹین سے پک کر آیا تھا اور سوجی کے تر بتر حلوے اور بھنے ہوئے گوشت پر مشتمل تھا۔ اس کھانے میں سارے سپروائزر' فورمین' انجینئر اور علی کے علاوہ چیف انجینئر اور مل کا مالک بھی آ کر شامل ہوئے تھے اور ان کے ساتھ ایسی باتیں کر رہے تھے جیسے پرانے دوستوں کے ساتھ کی جاتی ہیں۔ دو چار لقمے لینے کے بعد مل کے مالک نے بے تکلفی سے علی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا: ''شاباش نوجوان' تم ہیڈ فٹر کی آسامی کے قابل ہو۔ کیا نام ہے تمہارا؟'' زندگی میں پہلی بار علی سے مل کے مالک نے بات کی تھی۔ اس کے سارے بدن میں عجیب سی سنسنی دوڑ گئی اور اگلے چند گھنٹوں کے لئے وہ اپنی بیوی کو قطعی طور پر بھول گیا۔ اس کے بعد مالک نے دبلے پتلے مدقوق چہرے والے سپروائزر رحیم سے اس کا نام پوچھا اور اسے بتایا کہ اس نے آج سب سے زیادہ کام کیا تھا اور یہ کہ اسے تو جنرل فورمین ہونا چاہیے تھا۔ مالک کی طرف سے اتنا صاف اشارہ ترقی ملنے کے سلسلے میں کافی سے زیادہ تھا۔ خوش آئند خیالات سے اچانک روشنی کی وجہ سے رحیم شرما کر ہنسا اور جلدی جلدی حلوہ کھانے لگا اور جنرل فورمین کا منہ لٹک گیا اور اس کی زبان پر پڑا ہوا حلوہ سب کو نظر آنے لگا جس پر انگریز انجینئر نے نظریں پھیر کر برا سا منہ بنایا۔ اس کے بعد جلد ہی مالک اور چیف انجینئر نے بڑی اپنائیت کے ساتھ انہیں بتایا کہ وہ یونین کے لیڈروں کے ساتھ گفت و شنید کر رہے ہیں اور امید ہے کہ جلد ہی کوئی فیصلہ ہو جائے گا۔ جاتے جاتے مالک نے رک کر پوچھا [illegible] بند نہ ہو۔

ان کے جانے کے بعد باقیوں نے آپس میں بالکل پرانے ساتھیوں کی طرح باتیں کیں' ایک دوسرے کو کام کے متعلق ہدایات دیں اور اپنی جگہ واپس جانے سے پیشتر ہنسی مذاق بھی کیا۔ جب وہ مل ہاؤس کی طرف واپس آ رہا تھا تو علی کا دل ان سب فورمینوں اور انجینئروں کی طرف سے' جن سے وہ ہمیشہ نفرت کرتا آیا تھا' مکمل طور پر صاف ہو چکا تھا اور مل کے مالک کے لئے تو اس کے دل میں ایسے محبت کے جذبات موجزن تھے کہ اگر موقع ہوتا تو وہ بے سوچے سمجھے اس پر فدا ہو جاتا۔ اپنی جگہ پر پہنچ کر اس نے ساری طلوں کا چکر لگایا اور دل میں ہڑتالیوں کو کوستا اور ان کی ناکامی کی دعائیں مانگتا رہا۔

لیکن اب رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی اور وہ اس سارے قصے سے اکتاتا جا رہا تھا۔ سامنے وہی سماں تھا: بھرتی سے آتے جاتے ہوئے اکا دکا لوگ' جو ایک پلانٹ سے دوسرے پلانٹ کو جا رہے تھے' بیچ بیچ میں پولیس کے سپاہی' جو منہ اٹھائے گشت کر رہے تھے' تیزی سے کار پر گزرتا ہوا چیف انجینئر' وہ لوگ' جنہوں نے کبھی یہ چھوٹے چھوٹے (مگر بہت اہم) ہاتھ سے کرنے والے کام نہ کئے تھے' اب کر رہے تھے' بالکل اسی طرح جیسے وہ کر رہا تھا' کرتا آیا تھا۔ وہ لوگ جو کبھی راتوں کو فیکٹری میں نہ آئے تھے' جو اتنے بعید' اتنے اونچے' اتنے عظیم نظر آتے تھے اب اس کے ساتھ مل جل کر کام کر رہے تھے' گپیں مار رہے تھے' کھانا کھا رہے تھے۔ اس کی سیٹی کی آواز پر چونک اٹھتے تھے اور اس کی ہدایات پر عمل کر رہے تھے۔ شروع رات میں یہ سب باتیں اسے بڑی سنسنی خیز معلوم

ہوئی تھیں۔ یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ فیکٹری پر ایک بے حد انوکھا' عجیب و غریب' تہلکہ خیز سماں طاری تھا' جیسے میلوں پر جانے والی رات ہوا کرتا ہے' مصنوعی' فی الوقتی خوشی اور جوش و خروش کا' مل جل کر اٹھنے بیٹھنے کا' شادی بیاہوں والی راتوں کا' ایک عظیم اور وسیع بھائی چارے کا (گو وہ کل تیرہ آدمی تھے)۔ شروع میں جن مشینوں کے درمیان اکیلے پھرتے ہوئے اسے عظیم علیت' خود مختاری اور قوت کا احساس ہوا تھا رات کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ انہیں دل و دہل گڑگڑاتی ہوئی مشینوں کے درمیان کھڑے کھڑے اسی شدت کے ساتھ وہ احساس خوفناک کھوکھلی تنہائی اور بے چینی میں تبدیل ہو گیا۔ چلتی ہوئی مشینوں اور انسانوں کی باہمی رفاقت کی عجیب کہانی ہے۔ جب وہ پہلے پہل ان کے درمیان پہنچتا ہے تو اس کی ساری قوتیں کہیں دب جاتی ہیں سوائے قوت سامعہ کے جو اکیلی ان کی مہیب گڑگڑاہٹ کو جذب کرتی ہے اور انسان کی اپنی آواز کو کہیں دور گم کر دیتی ہے۔ اس چیلنج کو قبول کر کے انسان جبلی طور پر مشینوں کے مقابلے میں اپنی برتری کو ثابت کرنے کے لئے (یا کم از کم ان کی برابری کرنے کے لئے) جوش و خروش سے کام شروع کر دیتا ہے۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ اسے مشینوں کی مادی برتری کا احساس ہونے لگتا ہے' ان کی مادی برتری کا اور ان کی سرد بے حسی اور ان کی پاگل کر دینے والی یکسانیت کا اور ان کی پابندی وقت کا اور ان کی انتھک دشمنی کا اور ان کی پیداواری قوت کا اور ان کی لاتعلقی اور ان کی کمینگی کا' اور ان سارے انکشافات میں سے مشینیں ایک برتر دشمن کی شکل میں نمودار ہوتی ہیں [illegible] سے ایک عجیب احساس شکست' ایک نیا احساس تنہائی [illegible] اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ ساری مشینوں کی آواز کو دبا دیتی ہے اور انسان کو یکلخت خوفزدہ کر دیتی ہے۔

دروازے کے ساتھ کھڑے کھڑے علی نے آنکھیں بند کر کے سوچا کہ اس ساری دنیا میں اس کا کوئی پرسان حال نہیں رہا کہ وہ دور دور تک بھلا دیا گیا ہے۔

"سب ٹھیک ہے؟"

اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ "سب ٹھیک ہے۔" اس نے میکانکی طور پر دہرایا۔

"شاباش۔" فورمین نے کہا۔

"استاد میں ذرا... تھوڑی دیر کے لئے کینٹین چائے پی آؤں؟"

فورمین نے اسے بخوشی جانے کی اجازت دے دی۔ مل ہاؤس سے نکل کر وہ چار سو فٹ لمبی کلن کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میدان کے وسط میں بجلی کا فورمین ہاتھ پیچھے باندھے کھڑا احمقوں کی طرح منہ اٹھا کر بجلی کی روشنیوں کو تک رہا تھا۔ ایک سپروائزر بھاگتا ہوا اس کے پاس سے گزرا۔ ایک کتا آگے بڑھ کر علی کے پاؤں میں لوٹنے لگا۔ پھر ہو دم بخود کھڑا رہ گیا۔

چاروں طرف بھاگ دوڑ مچ گئی۔ کلن رک گیا تھا۔ چمنی سے دھواں نکلنا بند ہو چکا تھا۔ دھواں' جو باہر والوں کے لئے فیکٹری کی زندگی کا واحد نشان تھا۔ اس ایک دھوئیں کو جاری رکھنے کے لئے یہ ساری کوششیں کی گئی

تھیں اور وہ اب ختم ہو چکا تھا۔

کلن کے گرم ترین حصے کے عین نیچے بجلی کی موٹر، جو کلن کو گھماتی تھی، رک گئی تھی۔ دو فورمین اور دو سپروائزر اوزار اٹھائے بھاگتے ہوئے موٹر کے پلیٹ فارم پر چڑھے اور پچھلے پاؤں نیچے اتر آئے۔ وہاں پر کھڑا نہ ہوا جا سکتا تھا۔ اس جگہ پر کلن کے اندر چودہ سو ڈگری سینٹی گریڈ ٹمپریچر تھا۔ باہر...... آخیر مئی کے دن تھے...... چند سیکنڈ تک وہ چاروں نیچے کھڑے خالی خالی نظروں سے مردہ کلن کو دیکھتے رہے۔ پھر چیف انجینئر کی کار آندھی کی طرح آ کر ان کے پاس رکی۔ اس میں سے کار کے مالک کے ساتھ ساتھ مل کا مالک بھی نمودار ہوا۔ چیف انجینئر نے ایک لمحے کے لئے رک کر غصیلی نظروں سے چاروں کاریگروں کو دیکھا اور موٹر کی طرف بڑھا۔ اس کے پیچھے چاروں کاریگر سیڑھیاں چڑھ گئے۔ جلد جلد معائنہ کر کے چیف انجینئر اپنی زبان میں گالیاں بڑبڑاتا ہوا نیچے اتر آیا۔ معمولی سا نقص تھا۔ اس نے مالک کو بتایا۔ چند منٹوں کا کام تھا لیکن وہاں پر قیامت کی گرمی تھی۔ دونوں نے کار کے پاس کھڑے ہو کر چاروں کاریگروں پر نظریں دوڑائیں۔ چیف انجینئر نے زیر لب گالی دی۔ جب مالک کی نگاہ سلیم پر سے گزری تو اس نے جھپٹ کر فورمین سے اوزار لئے اور موٹر کے پاس جا پہنچا۔ اس کے پیچھے پیچھے تینوں آدمی بھی وہاں پہنچ گئے۔

اب سلیم تیز تیز اوزار چلا رہا تھا اور فیکٹری کا مالک پیشانی سے پسینہ پونچھتا ہوا بار بار چمنی کی طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ سلیم [illegible] تپش تھی [illegible] پسینہ [illegible] تھا۔ فورمین اس کے سر پر کھڑے اسے مختلف ہدایتیں دیتے اور ایک ایک کر کے اوزار پکڑاتے جا رہے تھے۔ مالک کی نظروں اور کلن کی تپش کے نیچے سلیم کے ہاتھ مشین کی طرح چل رہے تھے اور سانس دھونکنی کی طرح رواں تھا۔ مالک سوچ رہا تھا کہ کلن کا دھواں بند ہوتے دیکھ کر یونین والوں نے صلح کی گفت و شنید منقطع کر دی تھی۔ دوبارہ دھواں نکلنے لگے تو شاید ان کی ہمتیں پست ہو جائیں اور وہ پھر سے اسے تیار کر دیں۔ ان میں سے ایک سپروائزر کو سن کی بوری بھگو کر لانے کے لئے دوڑا دیا تھا تاکہ وہ کام کرنے والے شخص کے سر پر رکھ دی جائے جس سے کچھ بچاؤ ہو سکے۔ جب وہ سپروائزر گیلی بوری لے کر سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو سلیم نے اچانک رک کر پیٹ پر ہاتھ رکھا اور زمین سے جا لگا۔

اسے اٹھا کر نیچے لایا گیا اور چیف انجینئر مسلسل گالیاں بڑبڑاتا ہوا اپنی کار میں ڈال کر اسے فیکٹری کی ڈسپنسری کی طرف لے گیا۔ اس کی جگہ ایک فورمین نے لے لی اور چند منٹ کے اندر اندر کام ختم کر کے کلن چلا دیا گیا۔ مالک نے اطمینان کا لمبا سانس لیا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے ان تینوں کے کندھوں پر خوشی کے دھپ رسید کئے اور انہیں مبارک باد دیتا اور ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔

کلن کے Pier کی اوٹ میں کھڑے کھڑے علی نے سلیم کو جب وہ اسے کار میں لا د رہے تھے، صاف طور پر مرتے ہوئے دیکھا اور کینٹین کی طرف چل پڑا۔ کینٹین میں وہ دیر تک آگے رکھی ہوئی چائے کو پینے کا ارادہ کرتا رہا۔ پھر اسے اسی طرح چھوڑ کر چلا آیا۔ گیٹ کی جانب سے ہڑتالیوں کے ہلکے ہلکے نعروں کی آوازیں آ رہی

تیں۔ مٹی کا آسمان صاف اور روشن تھا اور چمنی کا دھواں چاند کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اس نے چیف انجینئر کی کار کو آ کر رکتے، فیکٹری کے مالک کو نکل کر کلن پلیٹ فارم پر چڑھتے، کلن چلاتے ہوئے فورمینوں اور انجینئروں سے دو منٹ تک باتیں کرتے اور پھر ان کی پیٹھ ٹھونک کر قہقہہ لگاتے اور جاتے ہوئے دیکھا اور وہیں کھڑا رہا۔ سامنے کلن کی موٹر تھی جس کو بطریق احسن ٹھیک کر دیا گیا تھا اور جو اب بخوبی چل رہی تھی۔ اسے ٹھیک کرنے والے فورمین فخر سے اکڑ اکڑ کر مالک سے باتیں کر رہے تھے اور مالک ان کی کامیابی پر طمانیت سے مسکرا رہا تھا اور دھوئیں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ باقی سارے فورمین اور انجینئر بھی دھوئیں کی طرف دیکھ رہے تھے اور اپنی مجموعی کامیابی پر مکمل طور پر خوش تھے۔ گیٹ کے باہر ہڑتالی بھی دھوئیں کی طرف دیکھ رہے تھے اور مایوسی سے نعرے لگا رہے تھے۔ صرف علیم وہاں نہیں تھا۔ اسے بھلا دیا گیا تھا، وہ جو مدقوق ہونے کے باوجود بڑا عمدہ کاریگر تھا۔

دفعتاً وہاں کھڑے کھڑے علی کے گنوار ذہن نے عجیب و غریب پاگل طریقے سے کام کرنا شروع کر دیا۔ اس نے ایسا خیالی منظر دیکھا جو اس طرح کے غیر تربیت یافتہ ذہن عمر بھر میں ایک آدھ مرتبہ ہی دیکھتے ہیں۔ اس منظر میں یہ سب کچھ شامل تھا۔ خیر و خوبی چلتی ہوئی بجلی کی موٹر، بڑی خاموشی اور صفائی کے ساتھ گھومتی ہوئی کلن، شور مچا کر چلتی ہوئی چکی، چاند کے سامنے سے گزرتا ہوا چمنی کا دھواں، بار بار پیشانی سے پسینہ پونچھتا اور فتح مندی کے قہقہے لگاتا ہوا سیاہ فام آدمی، غیر زبان میں کوسنے دیتا ہوا سفید فام آدمی، فخر سے اکڑ اکڑ کر باتیں کرتے اور سفید دانت نکال [illegible] مخلوق انسان......

اس نے متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ وہ کہاں تھا؟ وہ خود؟ بڑے واضح طور پر اس نے دیکھا کہ وہ خود اس منظر میں شامل نہ تھا۔ اس سارے نقشے میں اس کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ میں اس میں کہاں ہوں؟ اس نے سوچا۔ ''میں اس میں کہاں آتا ہوں؟'' اس نے بلند آواز سے کہا۔

وہ آہستہ آہستہ گیٹ کی طرف چل پڑا۔ ابھی وہ گیٹ سے چند قدم کے فاصلے پر تھا کہ باہر سے شور اٹھا۔ پھر یکلخت گیٹ کھل گیا اور ہڑتالی نعرے لگاتے ہوئے اندر داخل ہونا شروع ہوئے۔ جلوس کے آگے آگے فیکٹری کے مالک، چیف انجینئر اور یونین کا پریذیڈنٹ چل رہے تھے۔ تینوں کے گلوں میں ہار پڑے ہوئے تھے اور مزدور تینوں کا نام لے لے کر زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ علی اپنی مخصوص تھکی ہوئی مستقل چال سے ان کے پاس سے گزرتا گیا۔ جلوس کے وسط میں کسی نے طعن بھرے لہجے میں کہا: ''سائیں ٹوڈی۔'' ایک نفرت آلود قہقہہ بلند ہوا۔ جلوس کے آخیر میں کسی نے رک کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا:

''سائیں تم دل سے غریب ہو پر اب زیادہ دیر تک غریب نہیں رہ سکتے۔ ہماری چند شرائط مان لی گئی ہیں۔ ہمارے ساتھ آؤ۔ ہم جانتے ہیں وہ تمہیں کھینچ کر اندر لے گئے تھے۔ تمہارا کوئی قصور نہ تھا۔'' اس نے اجنبی لاعلم نظروں سے مخاطب کو دیکھ کر زیر لب کہا۔

''میں اس میں کہاں آتا ہوں؟'' اور آگے چل پڑا۔

اپنے گھر کے دروازے پر اس نے مڑ کر ایک تھکی ہوئی نگاہ فیکٹری پر ڈالی۔ لوگ اپنی اپنی جگہوں پر پہنچ چکے تھے۔ چمنی کا دھواں روشن آسمان پر لمبی سفید لکیر بناتا ہوا مغرب کی سمت جا رہا تھا۔ آخر مئی کی رات گرم اور پرسکوت تھی۔

(۴۰)

عام سطح پر زندگی جس تیزی اور شدت کے ساتھ اپنی طرف کھینچتی ہے' اسی تیزی اور شدت کے ساتھ مایوس بھی کرتی ہے۔ زندگی ایک عظیم اور مسلسل حرص ہے اور ہر چھوٹی بڑی حرص کی طرح انسانوں پر خوفناک پابندیاں عائد کرتی ہے اور پھر یک دم اپنی کشش کھو دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جس آسانی اور تیزی سے اس کی طرف مائل ہوتے ہیں' اسی آسانی کے ساتھ اسے رد کرنے پر بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بعض لوگ اپنی کوشش سے ایک بیکار تجربے میں داخل ہوتے ہیں اور اپنی کوشش سے ہی مایوس ہو کر محض اکتا کر باہر نکل آتے ہیں۔ (محض ایک دوسرے بیکار تجربے میں داخل ہونے کے لئے) اور بعض' جن کی بہت بڑی اکثریت ہے' خاموش رضامندی کے ساتھ روز بروز' لمحہ بہ لمحہ رہے چلے جاتے ہیں' اور کبھی کبھار جب شدید ذہنی اور روحانی کرب کی وجہ سے تھک جاتے [illegible] تجربات کی بدولت انہوں نے اپنی عقل و دانش میں بیش بہا اضافے کئے ہیں۔ ہم میں سے بہت کم کبھی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ گونگی رضامندی کا رویہ ایک بیماری ہے جس نے ہم سب کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور کہ اس بیماری کا نام ہے ''کاہلیت''۔ دوسرے لفظوں میں اسے صاف صاف انسانی بے عقلی بھی کہہ سکتے ہیں۔

ہمارے دور کے لاحاصل جذبوں کی طرح دنیاوی عقل و دانش بھی بے حد تھکا دینے والی شے ہے۔

روشن محل کا مشرقی حصہ' جس میں کمرہ نشست' خوابگاہ اور ایک سٹڈی شامل تھی' نعیم اور عذرا کی تحویل میں تھا۔ روشن محل کے نوکر چاکر ہی ان کی خدمت پر مامور تھے۔ پارلیمنٹ ہاؤس سے آنے کے بعد نعیم زیادہ تر وقت سٹڈی میں گزارتا۔ عذرا اس کے پروگرام میں کبھی مخل نہ ہوتی تھی۔ پچھلے چند برس سے وہ انتہائی سکون اور قناعت کے ساتھ زندہ تھی اور نعیم کے علاوہ روشن محل اور اپنے اردگرد زندگی کی ہر بات میں بے حد انہماک اور دلچسپی کے ساتھ حصہ لے رہی تھی۔ اس دوران میں اسے دیکھنے پر آسانی کے ساتھ کہا جا سکتا تھا کہ درمیانی عمر کی یہ خوبصورت صحت مند عورت اپنے طبقے کی خاص الخاص نمائندہ تھی اور زندگی میں اس نے محبت' نیکی اور مہربانی کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھا۔ اس قدر حیرت انگیز صلاحیت اس میں وقت کے صدموں کو برداشت اور نظر انداز کر دینے کی تھی۔

نعیم وزارت تعلیم میں انڈر پارلیمنٹری سیکرٹری تھا۔ اس عہدے پر وہ کیونکر مامور تھا' ٹھیک طور پر اس کا کسی

کو علم نہ تھا۔ بہر حال یہ سب جانتے تھے کہ اس میں روشن آغا کے ذاتی سیاسی رسوخ کا بڑا حصہ تھا۔ دفتری کام کا اسے کوئی تجربہ نہ تھا چنانچہ شروع میں کافی محنت سے اسے کام سیکھنا پڑا یہاں تک کہ آہستہ آہستہ وہ اس قابل ہو گیا کہ دن بھر کا کام وقت مقررہ کے اندر ختم کر لیتا۔ اس سے بہر حال اسے کوئی طمانیت حاصل نہ ہوئی اور اس کام میں وہ اپنے لئے کوئی دلچسپی پیدا نہ کر سکا۔ سب سے زیادہ احساس ناکامی اسے یہ تھا کہ باوجود ہزار کوشش کے اپنی شخصیت میں وہ بھاری بھر کم پن' قناعت' شائستگی' مکاری' خود غرضی اور بے غرضی کا ملا جلا انداز پیدا نہ کر سکا جو عموماً پہلے اور دوسرے درجے کے سرکاری اہلکاروں میں پایا جاتا ہے۔ اب آ کے پہلی مرتبہ شدت کے ساتھ اسے احساس ہوا تھا کہ اول اور آخر وہ کسان تھا اور کسان کا بیٹا تھا اور اپنے گاؤں اور زمینوں کی طرف لوٹ جانے کی خواہش نے اس کے اندر مستقل خلش کی صورت اختیار کر لی تھی۔ نئی شخصیت کو اپنانے کی کوشش میں اس نے اپنی قدرتی شخصیت بھی کھو دی تھی اور عجیب مضحکہ خیز کردار بن کر رہ گیا تھا۔ اس کا چہرہ سادہ لوح دیہاتیوں کی طرح بے تاثر اور صحت مند تھا اور آنکھوں سے سوائے بے کسی اور حماقت کے کچھ ظاہر نہ ہوتا تھا جیسے عام مویشیوں کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ اس زمانے میں تیزی سے سفید ہوتے ہوئے سر اور سیدھے' مضبوط جسم والے اس شخص کا عمدہ لباس' غیر متوازن چال ڈھال' حماقت زدہ چہرہ اور کام کرنے کا گونگا' بے اثر رویہ دیکھنے والے کے دل میں ترحم کے جذبات پیدا کرتا تھا۔ یوں اس کی حالت کچھ ایسی قابل رحم نہ تھی۔

گھر [illegible] بالکل ختم ہو چکا تھا۔ گو عذرا اب بھی اسی جوش و خروش سے اسے اپنے لگائے ہوئے پودے دکھاتی' اور کیاریاں جو اس نے تیار کی ہوتیں' اور وہ اس کے ساتھ اسی بے کسی اور وفاداری کے ساتھ پھرتا جس طرح دفتر میں کام کیا کرتا تھا' لیکن سارے دن میں اصل فراغت اور آسودگی وہ اس وقت محسوس کرتا جب اپنے مطالعے کے کمرے میں بند ہو کر کتابیں ٹٹولنا شروع کرتا۔ اس کی لائبریری اردو اور انگریزی زبان کی کتابوں پر مشتمل تھی جس کے بنانے میں اس سے زیادہ عذرا نے دلچسپی لی تھی۔ خود عذرا کو پڑھنے کی نہ فرصت تھی (کہ روز مرہ کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں وہ اس درجہ غرق رہتی تھی) نہ دلچسپی' لیکن نعیم کی خاطر اس نے اپنے مقررہ وظیفے کی مد سے' جو اسے روشن آغا کی طرف سے ملتا تھا' ہر قسم کی کتابیں فراہم کی تھیں۔ لمبی بیماری کے دوران نعیم کو جو بہت زیادہ سونے کی عادت پڑ چکی تھی اس سے چھٹکارا پانے میں اسے کافی دقت ہوئی۔ اب وہ بہت کم سوتا تھا۔ سر شام کمرے میں بند ہو کر جو وہ پڑھنا اور تمباکو پینا شروع کرتا تو رات کا کھانا بھی اکثر وہیں کھاتا اور آدھی رات گزرنے پر سونے کے لئے جاتا۔ اس کو اپنے قریب لیٹتا ہوا محسوس کر کے بہت تھوڑی دیر کے لئے عذرا کی آنکھ کھلتی اور ایک خفیف سی باسی خوشی کی لہر اس کے بدن میں دوڑ جاتی لیکن جلد ہی وہ سو جاتی کیونکہ جس شخص سے اسے گہری محبت تھی اس کی طرف سے اب وہ مطمئن اور لاپرواہ ہوتی جا رہی تھی۔ بہت کم ایسا ہوتا کہ رات کے اس سے اس کی نیند اڑ جاتی اور پھر وہ سو نہ سکتی۔ تھوڑی دیر تک تاریکی میں انتظار کرتے رہنے کے بعد وہ ایک سکی لے کر اس کے ساتھ لپٹ جاتی اور دیر تک جاگتی رہتی۔ کبھی کبھی

ایسا بھی ہوتا کہ سویرے جب عذرا اٹھتی تو نعیم کو مطالعے کی کرسی پر سویا ہوا پاتی۔ جگانے سے پیشتر وہ دیر تک دروازے میں کھڑی محبت، آزردگی اور ہلکے سے غصے اور نفرت کے ساتھ اسے دیکھتی رہتی۔ لیکن نعیم کے لئے جو ڈاکٹر کی طرف سے صبح سویرے لمبی سیر اور خاص قسم کی ورزش کی ہدایات تھیں ان پر وہ سختی سے عمل کرتی۔

علی الصبح سیر پر جانے والوں کو سڑک کے کنارے نعیم چھڑی کے سہارے آہستہ آہستہ لنگڑا کر چلتا ہوا ملتا۔ اس کا بازو تھامے ساتھ ساتھ اس کی بیوی چل رہی ہوتی اور نیچی آواز میں کوئی بات کرتی جاتی۔ پھر جب روشن محل والوں کے جاگنے کا وقت ہوتا تو وہ اکثر جو منظر سب سے پہلے دیکھتے وہ نعیم کا ہوتا جو عذرا کی مدد سے مختلف قسم کی ورزشیں بھونڈے پن کے ساتھ کر رہا ہوتا۔ سوائے نجمی کے یہ نظارہ ان میں سے کسی کے لئے کچھ زیادہ خوش کن نہ تھا۔ ان میں سے بعض نے تو اب ارادتاً صبح سویرے مشرقی لان کی طرف دیکھنے سے گریز کرنا شروع کر دیا تھا۔

مطالعے کا شوق نعیم کو ان دنوں ہوا جب وہ بیمار تھا اور کرنے کو اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ سب سے پہلے اس نے مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ تو اس کے بعد وہ اس سے بالکل اوب گیا اور بیزاری پڑ گئی۔ پھر وہ تاریخ کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ تبدیلی کسی طے شدہ پروگرام کے تحت نہ ہوئی بلکہ بالکل لاشعوری طور پر عمل میں آئی۔ ایک روز لیٹے لیٹے یوں ہی اس کا جی چاہا کہ تاریخ کی کوئی کتاب پڑھے۔ ساتھ ہی اس نے سوچا کہ وہ جو مذہب کا مطالعہ اتنے روز سے کر رہا تھا اس سے اس کو کیا حاصل ہوا تھا۔ اس کا ذہن اور روح جس دکھ میں مبتلا تھے اس میں ذرہ برابر کمی تو واقع نہ ہوئی تھی اور ا[illegible] مستقل اس کے ساتھ لگا ہوا تھا شدید ہو گیا اور اس نے پچھلی تمام کتابوں کو یکسر ترک کر دیا۔ اسی طرح تھوڑے تھوڑے وقفے پر وہ ایک موضوع سے مایوس ہو کر دوسرے کی طرف جاتا رہا اور پوری طرح سے کچھ بھی نہ پڑھ سکا۔ ہندوستان اور باقی دنیا کی تاریخ پڑھنے کے بعد اسے سائنس میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس میں اسے حساب، طبعیات اور سائنس کی تازہ ترین ایجادات نے بہت متاثر کیا۔ کچھ عرصے تک وہ انتہائی انہماک سے آسان زبان میں لکھی ہوئی انگریزی کی کتابیں پڑھتا رہا۔ لیکن سائنس کا مضمون دلچسپ اور حیرت انگیز ہونے کے باوجود اسے کھوکھلا سا لگا۔ جتنا زیادہ وہ اسے پڑھتا گیا اتنا ہی زیادہ الجھتا گیا۔ سائنس کے مطالعے نے اس میں احساس کمتری پیدا کیا اور ہر نئی چیز پڑھتے پر اسے لگتا کہ جیسے اب تک وہ کچھ بھی نہ جانتا تھا اور محض اس ایک شے کے جاننے پر اب وہ سب کچھ جان گیا ہے۔ اس کے دوسرے دن ہی وہ نئے سرے سے خلا میں بھٹکنا شروع کر دیتا۔ ہر نئے باب کے ساتھ اس کی بے چینی اور ذہنی اور روحانی ناداری کا احساس بڑھتا گیا اور ساتھ ہی سائنس کے مضمون سے اس کی گہری بیزاری میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس کے باوجود کتنے ہی عرصے تک وہ اسے ترک کرنے کی کوئی شعوری کوشش نہ کر سکا کیونکہ اس مضمون میں ایک وقتی دلچسپی اور آن بان کا احساس تھا جس سے وہ نجات حاصل نہ کر سکا۔ ہر انسان نہ چاہنے کے باوجود کئی ایک چیزوں میں ان کی خالصتاً خوش کن خصوصیات کے باعث پھنس کر رہ جاتا ہے۔ آخر ایک روز، غیر شعوری طور پر جیسا کہ اکثر ہوتا ہے بے حد اکتا کر اس نے اس مضمون کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا۔ اس کے کافی عرصے بعد اس نے ایک

UrduPhoto.com

روز سوچا کہ جو کچھ اس نے کیا' یا ہوا' عین مناسب تھا' کیونکہ اسے کسی بات کا بھی جواب نہ مل سکا تھا کہ جو سوالات اور الجھنیں اس کے دل و دماغ کو گھیرے ہوئے تھیں ان کا جواب وہاں پر تھا ہی نہیں' کہ سائنس کسی بنیادی سوال کا جواب نہیں دیتی' کہ اس تمام عرصے میں جو ایک دھیمی اور مسلسل آواز ضدی لہجے میں پکارتی رہی تھی: کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟' اس کا جواب وہاں نہیں تھا۔ کسی حد تک اس کا جواب اسے فلسفے میں مل گیا جس کی طرف اب اس نے رجوع کیا تھا' یا کم از کم اس نے یہ سمجھا کہ فلسفہ اس کا جواب ہے۔ فلسفے کی دنیا نے اسے تیزی سے مسحور کیا اور وہ ابتدائی آسان فلسفہ پڑھتے پڑھتے حقیقی دقیق جدید فلسفے تک آ پہنچا۔ فلسفہ سائنس کی طرح دلچسپ اور حیرت انگیز نہ تھا لیکن یہ گہرا' دیرپا اور سکون بخش موضوع تھا۔ سائنس کے مطالعے کے دوران اس میں جو عجلت کا انداز پیدا ہو گیا تھا اب جاتا رہا تھا۔ فلسفے کا ایک صفحہ پڑھ کر اسے کوئی خواہش باقی نہ رہتی اور اس کی طبیعت کی اداسی اور ٹھہراؤ کو تقویت پہنچتی۔ سائنس کے طلسم میں جو جکڑے جانے کا احساس تھا اس سے اب وہ آزاد ہو گیا تھا۔ بعض دفعہ وہ کتاب کھول کر ایک سطر پڑھتا اور آنکھیں بند کرکے تمباکو پینے لگتا۔ وقتی طور پر اسے گہری طمانیت کا احساس ہوتا اور اس کے دل میں کچھ بھی کرنے کی خواہش باقی نہ رہتی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے پر وہ آنکھیں کھولتا اور بند کر لیتا اور اسے محسوس ہوتا کہ زندگی میں کچھ بھی نہیں ہے' کوئی کام' کوئی جذبہ' کوئی مصروفیت' کوئی انتظار' کچھ بھی نہیں۔ صرف 'وہ' ہے اور اس کا تمباکو کا پائپ ہے اور لمبی آرام دہ کرسی ہے اور کتابوں سے بھری ہوئی الماریاں ہیں اور گہری آسودگی' عمیق امن کا احساس ہے۔ باہر کی دنیا اس کمرے میں ہر چیز کا خاتمہ ہے اور آزادی ہے اور وہ خوشی سے ساری عمر بتا سکتا ہے۔ کبھی کبھی وہ چھڑی کے سہارے چلتا ہوا نشست کے کمرے میں جا کر عذرا کے سامنے' جو بیٹھی موزے بُن رہی ہوتی' دیوار کی طرح کھڑا ہو جاتا۔ عذرا کو محسوس ہوتا کہ وہ اس کو یوں دیکھ رہا ہے جیسے کہ وہ کوئی احمق ہو' یا کوئی بے جان شے ہو جیسے میز یا کرسی' یا شاید کہیں بھی نہیں دیکھ رہا بلکہ سوتے میں چل رہا ہے.... کافی دیر کے بعد وہ چند بار آہستہ آہستہ دہراتا: ''تم جانتی ہو؟ تم جانتی ہو؟'' اس کا لہجہ حیرت ناک طور پر اداس' سرد اور پُرسکون ہوتا۔ عذرا' جو اس کے ساتھ رہنے کی عادی ہو چکی تھی' معمولی انداز میں ہنستی اور کوئی بات کرنے لگتی جس پر وہ اس کے پاس بیٹھ جاتا یا اس کی بات ادھوری چھوڑ کر واپس چلا جاتا۔

آہستہ آہستہ فلسفے کا اثر بھی زائل ہو گیا جیسے کہ تمام دنیاوی علوم کا اثر انسان کی زندگی میں جلد یا بدیر کبھی نہ کبھی ضرور زائل ہو جاتا ہے۔ اب وہ آہستہ آہستہ ورق گردانی کرتا اور خاموشی سے بغیر جانے ہوئے' دل و دماغ کے خالی ہو جانے کا ماتم کرتا رہتا۔ لیکن تمباکو کے دھوئیں اور کتابوں سے بھرے ہوئے اس کمرے سے نکلنا اب اس کے لئے بہت دشوار ہو چکا تھا۔ یہاں آن کر اس کو محسوس ہوتا کہ اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں رہی۔ ان کتابوں کی' لیمپ کی' میز اور کرسی کی' تمباکو کے ڈبے کی' کسی بھی شے کی نہیں۔ یہاں پر وہ اپنے حقیقی ننگے وجود میں آ جاتا اور اپنے آس پاس کی ہر شے کے ساتھ پرانے سادہ دل دوستوں کی طرح ملتا جن کے ساتھ آپ مکمل بے نیاز اور بے زار طور پر رہ سکتے ہیں۔ یہ چھوٹا سا کمرہ اس کے لئے ہر قسم کی آزادی کی' ہر چیز کے خاتمے کی ایک نئی علامت بن چکا تھا۔

UrduPhoto.com

یہی وجہ تھی کہ گھر سے باہر وہ ہمیشہ کسی نہ کسی سہارے کی تلاش میں رہتا۔ مگر چونکہ وہ ایک بوڑھے ہوتے ہوئے اُکتائے ہوئے آدمی کی طرح روحانی طور پر منکسر لیکن ذہنی طور پر پُر تکبر تھا اس لئے بہت کم لوگوں سے مرعوب ہوتا' اور جو لوگ اسے مرعوب کرتے ایک حاسدانہ جذبے کے زیر اثر وہ شاذ و نادر ہی ان کے قریب ہو سکتا۔ ان دنوں اس تنہا صورت انسان پر ابتلا کا یہ دور آیا تھا۔

صرف پارلیمنٹری سیکرٹری انیس الرحمان ایک ایسا شخص تھا دفتر بھر میں جس کے ساتھ نعیم کو دلچسپی تھی۔ وہ عمر میں نعیم سے چند برس بڑا چھوٹے قد کا تنومند آدمی تھا۔ اس کے گال اگر اتنے پھولے ہوئے' گردن اتنی موٹی اور بال ماتھے پر بہت نیچے تک اُگے ہوئے نہ ہوتے تو خوبصورت کہلایا جا سکتا تھا۔ پچاس برس کے لگ بھگ ہونے کے باوجود اس کے بال بے حد سیاہ اور کھردرے تھے اور تیز ذہین آنکھیں گوشت کی فراوانی کی وجہ سے اندر کو دھنسی ہوئی تھیں جن پر وہ سنہرے فریم کا نازک سا چشمہ لگائے رکھتا تھا۔ وہ جنگلی بھینسے کی سی پھرتی اور قوت کے ساتھ چلتا پھرتا تھا اور جب جوش میں ہوتا تو اس کے ہاتھوں اور گردن کے بال کھڑے ہو جایا کرتے۔ کسی نے اسے کبھی سست یا بیکار بیٹھے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ دفتر کا کام وہ پلک جھپکنے میں ختم کر دیتا اور پھر اپنے دوستوں کو خط لکھتا یا فون پر اپنی بیوی سے باتیں کرتا رہتا۔ جب کوئی کام نہ ہوتا تو اٹھ کر دفتر میں چکر لگانے لگتا اور ہر ایک سے ایک ساتھ باتیں کرتا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اس کو کسی سے شخصی دلچسپی نہ تھی۔ وہ کسی کی خیریت دریافت کرتا یا کسی سے ہمدردی کی باتیں [illegible] ضروری نہیں کہ یہ بات صحیح ہو لیکن کوئی ایسی بات ضرور تھی جس سے دوسروں کو ایسا خیال ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ کام کرنے والے اس سے ڈرتے ضرور تھے' شاید حاسدانہ عزت بھی کرتے تھے' پر محبت نہ کر سکتے تھے۔ اس کو اس بات کا علم تھا۔ اس کے باوجود نمایاں طور پر کوشش کئے بغیر وہ شخص جس حلقے میں گھومتا' جس محفل میں موجود ہوتا سب پر غلبہ کئے رہتا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے پاس ہر بات کا' ہر واقعے کا نہایت دانشمندانہ اور صحیح جواب موجود تھا۔ اس کے انداز کے غیر شخصی پن کے باوجود ایک عجیب طرح کی گرمی اور مٹھاس تھی جو لوگوں کو اس سے ڈرنے' اس کی عزت کرنے اور اس سے مرعوب ہونے پر مجبور کرتی تھی۔ جب وہ باتیں کر رہا ہوتا تو اس کی تیز آنکھوں اور ہاتھوں کی جنبش سے ایک سحر سا پیدا ہو جاتا جو وقتی طور پر بہت طاقتور ہوتا۔ وہ ان لوگوں میں سے نہ تھا جن کے جانے کے بعد دیر تک آپ ان کے متعلق سوچتے رہتے ہیں' مگر وہ جتنا عرصہ موجود رہتا آپ اس کے سحر میں مبتلا رہتے تھے اور اس کے مقابلے میں اپنی کم تر حیثیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

وہ ایک بار نعیم اس کے گھر پر بھی گیا جہاں اس کی بیوی اس کی پہلی بیویوں کے دو بچوں کی نگہداشت کرتی تھی۔ بلقیس بمشکل پچیس برس کی صحت مند اور خوش مزاج لڑکی تھی اور اس کی تیسری بیوی تھی۔ پہلی ملاقات میں ہی نعیم کو علم ہو گیا کہ وہ معمولی پڑھی لکھی خوش شکل لڑکی عمر کے تفاوت کے باوجود اپنے خاوند سے مکمل طور پر خوش تھی اور بہت سلیقے سے گھر اور بچوں کو صاف ستھرا رکھتی تھی۔ زندگی کی طرف اس کا ایک صحت مند عامیانہ رویہ تھا۔ وہ بہر حال

ایسی عورت نہ تھی جس سے نعیم متاثر ہو سکتا چنانچہ اس نے اسے نظر انداز کر دیا۔ بلقیس نے بھی اس سفید بالوں والے ادھ گنجے اور چھڑی کے سہارے لنگڑا کر چلتے ہوئے غیر دلچسپ آدمی کو کوئی زیادہ اہمیت نہ دی۔

(۳۱)

شروع جاڑوں کے دن تھے جب نعیم انیس الرحمان اور اس کے گھر والوں کے ساتھ مچھلی کے شکار کو گیا۔ انیس الرحمان باقاعدگی کے ساتھ ہر دوسرے ہفتے بیوی بچوں کو لے کر شہر سے بیس میل دور مچھلی کے شکار کو جاتا جہاں دریا کے کنارے اس کی ایک مختصر سی کوٹھی اور ایک موٹر بوٹ تھی۔ آموں کے باغ میں گھری ہوئی وہ چھوٹی سی مغربی وضع کی کوٹھی ٹھنڈی اور پُر سکون تھی۔ یہاں پہنچ کر نعیم کے دل میں ہلکی سی بے چینی پیدا ہوئی۔ وہ بے نام سی کسک جو کھوئے ہوئے سکون کی نشان دہی کرتی [illegible] کبھار دل پر ابھر کر انسانی تلاش کی علامت بن جاتے ہیں۔ ا[illegible] گاؤں اور بڑے بڑے گھنے پیڑوں والا باغ اور تمدار عطا ور زمین جس کی ٹھنڈک میں متلاشی آنکھوں اور تھکے ہوئے دلوں کے سارے جذبے جنتے پھولتے اور پرورش پاتے ہیں جیسے پھول اور پودے اور سرسبز گھاس اور یہاں پر ہر انتظار اور ہر تلاش ختم ہو جاتی ہے...... ہفتے کی شام کو جب وہ وہاں پہنچے تو کھانا کھانے سے پیشتر انیس الرحمان [illegible] وہ [illegible] کے ایک قطعے میں جو بیٹھنے کے لئے مخصوص تھا۔ سرو کے درخت کھڑے تھے۔ بیچ بیچ میں ایک آدھ یوکپٹس کا درخت بھی نظر آ جاتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی روشیں نہایت سیدھی اور صاف تھیں اور کہیں کہیں گملے رکھے ہوئے تھے۔ پچھواڑے کی طرف اونچا سا کھجور کا درخت اکیلا کھڑا تھا جس کے پیچھے کوٹھی کے رکھوالے کا گھر تھا۔ درخت کے ساتھ انیس الرحمان کا گھوڑا بندھا تھا جو انہیں دیکھ کر ہنہنایا۔ نعیم نے پسندیدگی سے اصیل جانور کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور اس کی تعریف کی۔ واپس آتے ہوئے وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولا: ''مجھے یقین تھا یہاں آ کر مجھے خوشی ہوگی' اسی لئے ...... میں اسی لئے......'' اس نے چونک کر انیس کی طرف دیکھا' پھر ہاتھ اٹھا کر ہتھیلی پر دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ''اکیلا ہی آیا۔''

انیس الرحمان اپنے مخصوص انداز میں ہنسا جس سے اس کی نازک سنہری عینک ناک سے اوپر اٹھ گئی۔

''یہاں آ کر مجھے سکون ملتا ہے۔ میں جب پہلی بار سر لارنس کے ساتھ یہاں آیا تو اسی روز میں نے فیصلہ کر لیا کہ ایک نہ ایک روز میں اس جگہ کو ضرور خریدوں گا۔ مجھے علم تھا تم یہاں آ کر خوش ہو گے۔ تم شہر کے باسی نہیں ہو۔ میں جانتا ہوں۔''

''ہاں۔'' نعیم نے کہا۔

صبح سویرے وہ اور اس کا میزبان مچھلی کے شکار کا سامان اٹھا کر دریا کی سمت روانہ ہوئے۔ خزاں کا موسم تھا اور صبح کی ہوا میں شیشم کے درختوں کے خشک پتے کھڑکھڑا کر گر رہے تھے۔ رستے میں انہیں ساتھ والے گاؤں

کے کچھ لوگ صبح کی سیر اور رفع حاجت کے لئے جاتے ہوئے ملے۔ آگے چند جھونپڑیاں آئیں جن میں قحط زدہ بنگالی کنبے جو روٹی کی تلاش میں وطن سے ہجرت کر آئے تھے' پناہ گزین تھے۔ اکا دکا کسان بیلوں کی جوڑیاں لئے ہل چلانے کے واسطے جا رہے تھے۔ دونوں شکاری مقررہ جگہ پر پہنچ کر رک گئے۔ اس جگہ شیشم کے درختوں کا بہت بڑا جھنڈ تھا اور نیچے دریا کے کنارے کے پتھر زرد اور قرمزی رنگ کے چھوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ انہوں نے شانوں پر سے تھیلے اتار کر نیچے رکھے اور ڈوریاں اور چھڑیاں تیار کرنے لگے۔

''مچھلی کا شکار تمہارے لئے بہت موزوں ہے۔'' انیس الرحمان نے کہا اور اس کو اس جگہ کی خصوصیت بتانے لگا۔ اس نے بتایا کہ اس جگہ پر درخت اس طور سے اگے تھے کہ سارا دن ان پر دھوپ نہ پڑ سکتی تھی اور کنارے کے مخصوص کٹاؤ کی وجہ سے اس جگہ دریا ایک چھوٹے سے تالاب کی شکل اختیار کر گیا تھا جس میں مچھلیاں کثرت سے ملتی تھیں۔ پھر جب انہوں نے چھڑیاں اور ڈوریاں تیار کر لیں تو وہ دیر تک نعیم کو ڈوری پھینکنے اور کھینچنے کا صحیح طریقہ سمجھاتا اور مشق کراتا رہا۔ جب سورج ایک نیزہ پر آ گیا تو وہ اپنی اپنی ڈوریاں پھینک کر سکون سے بیٹھ چکے تھے اور انیس نعیم کو ایک [illegible] کنڈی پر کیکڑا اچھا کر صحیح Bait لگانے کا طریقہ بتا رہا تھا۔ جب یہ موضوع بھی ختم ہو گیا تو وہ نیچی آواز میں جو کہ مچھلیوں تک نہ پہنچ سکتی تھی' اسے اس دریا میں پائی جانے والی مختلف اقسام کی مچھلیوں کی بابت بتانے لگا۔

اب [illegible] سی چھلانگ لگا کر غائب ہو جاتی۔ دریائی ہوا کے زور سے شیشم کے پتے ان کے سروں پر اور آس پاس ساری جھیلوں پر گر رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ملا ہوا دریا کے بہنے کا اور آبی پرندوں کا شور تھا۔ دونوں مردوں کی ڈوریوں کے تار پانی کی سطح پر ڈول رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی چھوٹی سی شرارتی مچھلی راستہ بھولی ہوئی کنڈی پر منہ مار جاتی۔ بڑی مچھلی ابھی تک کوئی نہ لگی تھی۔

نعیم نے پائپ ہونٹوں سے جدا کیا اور سطح آب پر سے نظر اٹھا کر پہلی بار بات کی:

''تم نے انہیں دیکھا۔ وہاں؟'' اس نے سر سے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔

انیس نے غور سے اسے دیکھا اور کندھے اچکا کر بولا: ''اوہ... بنگال۔ تمہیں پتا ہے۔ بنگال۔''

نعیم پھر سطح آب پر دیکھ رہا تھا۔ انیس ایڑیاں اٹھا کر اپنے بیوی بچوں کی راہ دیکھنے لگا جو ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ پھر وہ نعیم کو دوسری ڈوری کا خیال رکھنے کے لئے کہہ کر کنارے کنارے چلتا ہوا دور تک چلا گیا۔

جب وہ واپس آیا تو نعیم اسی طرح بیٹھا تھا اور ایک کوا کیکڑوں کے ڈبے میں چونچ مار رہا تھا۔ انیس کو اپنے قریب کھڑا پا کر نظر اٹھائے بغیر وہ بولا:

''انہیں مصیبتیں کیوں نازل ہوتی ہیں؟''

انیس اداسی سے مسکرا کر خاموش ہو رہا۔

UrduPhoto.com

''انسانوں پر ظلم کیوں ہوتے ہیں؟'' نعیم تیزی سے بول اٹھا۔ ''انصاف کیوں نہیں ہوتا؟ انصاف کدھر گیا؟''

چند لمحے تک ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کے بعد دونوں نے ایک ساتھ نظریں پھیر لیں۔ نعیم کا ناڑ غائب ہو چکا تھا۔ اس نے ڈوری کھینچ کر مچھلی کو باہر نکالا۔ یہ ایک فٹ لمبی پتلی سی راکھ کے رنگ کی مچھلی تھی۔ نعیم کو ایک ہاتھ کی مدد سے کنڈی سے مچھلی چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ کر انیس الرحمان نے ڈوری اس کے ہاتھ سے لے لی اور آہستہ سے مچھلی کو الگ کر دیا' پھر کنڈی پر نیا کیکڑا لگا کر اسے پانی میں پھینکتے ہوئے وہ لاتعلق انداز میں بنگال کے قحط کی باتیں کرنے لگا۔

نعیم نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کیا: ''مصیبتیں کیوں نازل ہوتی ہیں؟'' اس نے غصے لہجے میں کہا۔

ایک لمحہ رکنے کے بعد انیس الرحمان تیزی سے' انہماک سے' جذبے سے بولنے لگا:

''میں بھی اسی طرح سوچتا ہوں۔ اسی طرح ایک وقت تھا جب میرا خیال تھا کہ مصیبتیں بڑے آدمیوں کی وجہ سے نازل ہوتی ہیں اور ایک سادہ سے اصول کے مطابق گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ مگر اصول؟ اصول کیا چیز ہیں؟ مجھے پتا چلا کہ وہ عقلمندی کی باتیں جو میں نے لڑکپن اور جوانی میں سیکھیں' وہ سارے زریں اقوال..... کچھ بھی نہیں ہیں۔ اگر تمہیں بندھے ٹکے اصولوں کے مطابق ہی زندگی بسر کرنا ہے تو پھر قحط بیچ میں کہاں آتا ہے؟ پھر اس میں' وہ کہاں آتا ہے۔'' وہ رکا۔ ''نعیم تم وہاں نہیں تھے۔ تم نے صرف ان کو دیکھا ہے جو زندہ ہیں' ان کو نہیں دیکھا جو [illegible] جوان اور بوڑھے اور بچے' چھوٹے اور بڑے' بھیک مانگ رہے ہیں۔ اچھے اور بڑے سب بھکاری ہو گئے ہیں۔ ہر کوئی خوراک کے لئے زندہ ہے یا خوراک کے لئے مر رہا ہے۔ مٹھی بھر چاولوں کے لئے یا چاولوں کے پانی کے لئے۔ وہ اتنے سے چاولوں کے باعث مر رہے ہیں یا امیر ہو رہے ہیں۔ یہ وہ وقت آیا ہے جب شدید انسانی کیفیات زندگی میں داخل ہو کر عام حالات کا درجہ اختیار کر لیتی ہیں۔ اگر تمہارے پاس کچھ نہیں ہے تو بھیک مانگو گے' اگر کچھ ہے تو اسے بیچ کر امیر بن جاؤ گے۔ زندگی بہر حال تھوڑے سے اناج پر منحصر ہو کر رہ گئی ہے۔ اب یہاں سے ایک سادہ سا اصول بنا لینا نہایت آسان ہے۔ کہ زندگی مختلف اور متضاد حالات کے پیش نظر بے حد عزیز اور بامعنی اور پھر بے حد سستی اور بے معنی ہو سکتی ہے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ آپ نے اصول بنا لیا اور مطمئن ہو گئے۔ پر میں نہیں۔ میں پوچھتا ہوں انصاف کہاں گیا؟ انصاف' جو ہم نے صدیوں کے الٹ پھیر سے سیکھا ہے۔ جنگوں اور وباؤں اور قحطوں اور زلزلوں اور دوسری آسمانی بلاؤں کے بعد سیکھا ہے۔ کیا آپ اس سے کوئی خاص اصول وضع کر سکتے ہیں؟ کوئی ضابطہ؟ کوئی 'پیٹرن' یا گزشتہ زمانوں سے حاصل کئے ہوئے تمام انسانی علم' تمام انسانی دکھ کا کوئی 'پیٹرن'؟ ہیں آج اس بات کا علم ہے کہ یہ لمبی چوڑی اور انتہائی متضاد اور منتشر آفتیں تھیں جو ہم پر اور ہمارے آباؤ اجداد پر نازل ہوئیں۔ ہم نے ان سے سوائے زریں اقوال کے کیا حاصل کیا ہے۔ سنہری اصول۔'' وہ طنز سے ہنسا۔ ''جو انسانی مشاہدے کی ایک بے حد سطحی کاوش ہیں' کسی چیز سے بھی حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ دودھ کے گلاسوں سے' یا ٹوٹی پھوٹی موٹر گاڑیوں سے یا

آدمی اور بھینس کی باہم لڑائی سے بھی...... مثلاً یہ کہ "اے انسانو! بھینسوں سے مت لڑو۔" دوسرے لفظوں میں سنہری اصول انتہائی متضاد واقعات سے بھی اخذ کئے جا سکتے ہیں' لیکن کیا ہم اتضاد سے انصاف حاصل کر سکتے ہیں؟ یا انصاف کی کوئی صورت ہی؟ جب کہ اصول' جو کہ ایک سطحی اور بے بس مشاہدے کا نتیجہ ہیں' متضاد اور منتشر ہونے کے باوجود ایک ہی عنوان کے تحت ترتیب دیئے جا سکتے ہیں' انصاف کے ساتھ ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا اثر براہ راست اور گہرا ہے۔ اصول ایک بے بسی کا علم ہیں جن کا ہماری زندگیوں سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک کتاب کی طرح۔ آپ کے اختیار میں ہے کہ پڑھ کر اس سے مستفید ہوں' یا اسے اٹھا کر شروع سے آخر تک پڑھیں اور بھول جائیں' یا پھر اسے ہاتھ تک نہ لگائیں اور میز پر محض گرد کے نیچے دبنے اور گلنے سڑنے کے لئے چھوڑ دیں...... انصاف کے ساتھ بھی آپ ایسا برتاؤ کر سکتے ہیں؟ نہیں۔ یہ میرے یا آپ کے انتخاب کی بات نہیں ہے' یہ میری یا آپ کی مرضی پر منحصر نہیں ہے۔ انصاف دوسری آسمانی آفتوں کی طرح ہم پر عائد کیا جاتا ہے اور ہمارا مقدر بن جاتا ہے۔ یہ تمام انسانی تاریخ' تمام انسانی دکھ پر حاوی ہے۔ پھر کیوں میں پوچھتا ہوں کیوں' جبکہ آسمانی انصاف کا کوئی 'پیٹرن' نہیں ہے تو کیوں ہم انسانوں کے انصاف کی تائید کریں؟ جنگوں اور قحطوں اور وباؤں میں انصاف کہاں تھا؟ ہم کیسے انسانوں کی زندگیوں پر حکومت کرنے کے لئے اصول وضع کر سکتے ہیں جبکہ انسانوں کے 'مقدر' کے لئے کوئی اصول نہیں ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ چند بے روح' مردہ دل' یاسیت پرست اور بیمار پڑھے لکھے لوگوں کا ایک گروہ دوسرے انسانوں کی زندگیوں [illegible] بے خبر اور بے بس ہیں اور ان قوتوں کے متعلق کچھ نہیں جانتے جن کے ہاتھ میں ان کا خاتمہ ہے۔ تم نے ان لوگوں کی بے بسی دیکھی ہے جب وہ جنگ یا قحط کے دوران اپنے قانون چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ایک شخص کو بھی مرنے سے 'ختم ہونے' سے نہیں بچا سکتے مگر اپنی بدنما شان و شوکت کے ساتھ' چہروں پر مصنوعی سکون طاری کئے کاغذوں اور دفتر کی میزوں کے ساتھ اپنا پیشہ جاری رکھتے ہیں۔ جب وہ معصوم انسانوں کو موت سے نہیں بچا سکتے تو اپنے 'قلم' کاغذ اور دفتر کے فرنیچر کو بچانے کی جان توڑ کوشش کرنے لگتے ہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ وہ نالائق ہیں؟ نہیں۔ اس سارے وقت میں انہیں مستقل اپنے کام کی بے اثر اور نفرت انگیز نوعیت کا علم رہتا ہے۔ وہ نالائق نہیں ہیں' نااہل ہیں۔ صاف صاف نااہل۔"

وہ چشمہ اتار کر شیشے صاف کرنے لگا۔ بلقیس اس دوران میں اس کے قریب آ کھڑی ہوئی تھی۔ انہیں عجیب سی سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ اسے اس طرح اپنی طرف تکتے ہوئے پا کر وہ خاموشی سے مڑ کر اس طرف کو چلی گئی جدھر اس کے دونوں بچے پایاب پانی میں کھڑے ململ کا دوپٹہ ڈبو ڈبو کر مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ جب دوبارہ چشمہ چڑھا کر وہ بولا تو اس کی آواز گہری اور اداس تھی۔

"یا شاید نااہل بھی نہیں ہیں' صرف احمق ہیں۔ احمق۔ کیونکہ پھر میں نے انہی آدمیوں کو مضحکہ خیز طور پر مرتے ہوئے دیکھا۔ وباؤں میں اور۔ وہ اپنے انصاف کے قوانین یہیں پر چھوڑ کر بے بس' بے کس لوگوں کی طرح مر گئے' اس قوت کے زیر اثر جو ان کے انصاف کے قوانین کی کوئی پروا نہیں کرتی۔ اس کا اپنا انصاف ہے۔ یہ وہی

بے معنی موت تھی جو ہر کسی کو آتی ہے۔ وہی بے کسی کی موت جو کتے کو آتی ہے۔ قوانین دو بار مرتے ہیں۔ بہتر موت ان کے لئے وہ ہے جب وہ غلط ثابت ہوتے ہیں اور بدل دیئے جاتے ہیں' ہر زمانے میں۔ اور بدتر موت ان کے لئے وہ ہوتی ہے جب کہ وہ ابھی لاگو ہوتے ہیں اور ان کی نفی کی جاتی ہے' زلزلوں وباؤں جنگوں کی مدد سے۔ جب آفتیں نازل ہو کر مکمل طور پر ان کی نفی کرتی اور تمام انسانی زندگی کو ابدی طور پر بے معنی ثابت کرتی ہیں۔ وبا کے بعد اگر ایک شہر میں سو یا دو سو آدمی بچ جاتے ہیں تو کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ زندگی کی نشانی ہے؟ یہ موت ہے۔ ایک انسان کی موت سب کی موت ہے کیونکہ زندگی یکساں ہے اور موت بہر حال موجود ہے' تمہاری یا میری یا میرے بچوں کی' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر میں تمہیں قتل کرتا ہوں تو پھانسی پر چڑھوں گا' نہیں کرتا تو قحط میں مروں گا یا جنگ میں یا کسی گلی یا ہسپتال میں ہی مر جاؤں گا۔ کیا فرق پڑتا ہے؟"

نعیم نے بے خود ہو کر نفی میں سر ہلایا۔ انیس الرحمان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی اور وہ نعیم کی طرف جھک کر بولا۔ "یہی تو میں پوچھتا ہوں۔ اگر کوئی فرق نہیں پڑتا تو انصاف کہاں گیا؟ یہی تو میں پوچھتا ہوں۔ تم نے انصاف کے متعلق پوچھا تھا نا۔ یہی تو میں بھی پوچھتا ہوں۔ یہی تو..."

وہ ہانپ کر رک گیا۔ بلقیس اور بچوں نے جو گھٹنوں گھٹنوں پانی میں کھڑے تھے' کپڑے کی مدد سے ایک خاصی بڑی مچھلی پکڑ لی تھی۔ بلقیس پونچھ کی طرف سے تڑپتی ہوئی مچھلی کو پکڑے کھڑی تھی اور بچے تالیاں بجا رہے تھے۔ اس نے [illegible] بچوں کی طرف [illegible] مچھلی انہیں دکھا کر تالیاں بجانے لگی۔ انیس الرحمان اٹھا اور نعیم کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے کشتی کی طرف چل پڑا۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ انیس کی ڈوری کے ساتھ مچھلی تھی لیکن وہاں اب کوئی نہ تھا۔ بلقیس کمر پر ہاتھ رکھے غصے سے انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

کشتی میں بیٹھ کر انہوں نے انجن چلایا اور رخ بہاؤ کی مخالف سمت کا کر لیا۔ انجن کی آواز سے دریا میں بیٹھے ہوئے پتلی پتلی ٹانگوں والے ہلکے پھلکے سفید پرندے مچھلیوں کا ناشتہ چھوڑ کر اڑے اور آبی آوازوں میں شور مچانے لگے۔ پانی بارشوں کی وجہ سے گدلا ہو رہا تھا اور اس پر دھوپ پھیل چکی تھی۔ سطح آب کو کاٹتے اور چھینٹے اڑاتے ہوئے وہ تیزی کے ساتھ چند دوسری کشتیوں کے قریب سے گزرے جن میں سیاہ بدن مچھیرے کھڑے خاموشی سے جال پھینک رہے تھے۔ دور سے کشتی کے انجن کی آواز سن کر انہوں نے خفگی سے سر اٹھایا لیکن جب وہ قریب سے گزرے تو انیس الرحمان کو پہچان کر جھک کر سلام کرنے لگے جسے اس نے نہ دیکھا' صرف نعیم نے ہاتھ اٹھا کر جواب دیا۔ ان کی مچھلیاں بھاگ گئی تھیں مگر وہ مرعوب ہو چکے تھے۔ لمبا لمبا سال کی افتاد نے اسی صورت میں انہیں زندہ رہنے کے اہل بنا دیا تھا۔

چند میل اوپر جا کر اس نے انجن بند کر دیا اور کشتی کو دھارے کے ساتھ بہنے کے لئے چھوڑ دیا۔ پھر وہ اٹھ کر نعیم کے قریب آ بیٹھا۔

''دراصل 'وہ' کہیں بھی نہیں ہے۔ وہ صرف ہمارے یہاں پر ہے۔'' اس نے چاروں انگلیوں سے اپنے سر کو ٹھونکا۔ ''یہاں ---- اور یہاں پر اور کچھ بھی نہیں ہے۔ حالانکہ یہاں عقل کو ہونا چاہیے۔''

نعیم حیرت اور افسردگی سے اسے دیکھتا رہا۔

''جانتے ہو ہم نے خدا کو کیوں ایجاد کیا ہے؟ اپنے آرام کی خاطر۔ کیونکہ ہم سوچنا نہیں چاہتے اور سچائی کی تلاش میں سوچنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے' فصل کاٹنے اور بچہ جننے سے بھی زیادہ مشکل۔ ہم سہل پسند ہیں کیونکہ ہم اسی طرح پیدا ہوئے ہیں۔ اس کا نتیجہ جانتے ہو کیا ہے۔ ہم احمق ہیں۔ احمق دنیا بھر کی کتابیں پڑھ کے تم سمجھتے ہو کہ عالم بن گئے ہو۔ ٹھیک ہے کہ تم نے افلاطون کے برابر علم حاصل کیا اور جاہل نہیں رہے۔ لیکن کیا یہ کافی ہے؟ دنیا کے زیادہ تر عالموں نے کتابیں پڑھتے اور لکھتے ہوئے زندگیاں گزاریں۔ ان میں اور اس طوطے میں جو 'میاں مٹھو' 'میاں مٹھو' کہہ کر زندگی بسر کرتا ہے کوئی فرق نہیں کیونکہ عام طوطوں میں وہ بھی عالم طوطا ہوتا ہے۔ مجھے طوطوں کے متعلق زیادہ علم نہیں لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ ایک وقت آئے گا جب لوگ آج نہیں تو کل' کل نہیں تو پرسوں' جو ان سب لوگوں کا بیزاری اور حقارت کے ساتھ ذکر کریں گے اور اپنے زمانے کے لوگوں کو [illegible] سوچنے کی تلقین کریں گے۔ محض سمجھنے کی۔ تم کچھ بھی نہیں سمجھ سکتے اس لیے کہ تم عالم ہو' کہ تم جاہل نہیں ہو' کہ تم احمق ہو' ہم میں ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہی ہے۔ تم بھی اور میں بھی۔'' وہ اٹھ کر انجن کے پاس گیا اور جھک کر اسے [illegible] کرنے لگا۔ پھر کپڑے میں ڈال [illegible] اور [illegible] کر اس طرح بھاگا جیسے کہ کوئی اس کے پیچھے لگا ہوا ہو۔

UrduPhoto.com

''اس کی آواز سن رہے ہو؟'' انیس نے انجن کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ ''کیا تمہیں کسی اور شخص کی ضرورت ہے جو آکر یہ بتائے کہ انجن چل رہا ہے۔ یا اس کشتی کے پیندے میں چھید ہو جائے اور پانی اندر آنے لگے تو کیا تم بیٹھ کر انتظار کرتے رہو گے کہ کوئی دوسرا تمہیں آکر بتائے کہ تم ڈوب رہے ہو؟'' وہ رکا۔ ''نہیں؟ ٹھیک۔ تو پھر 'اس' کی کیا ضرورت ہے؟ اس نے جو مدرسہ جاری کیا ہے' مذہب' اس سے کیا حاصل؟ دنیا کے تمام مذاہب محبت کا پرچار کرتے ہیں۔ مگر ہوتا کیا ہے۔ جونہی آپ ایک مذہب کو اپنا لیتے ہیں آپ کے دل میں نفرت کا' تعصب کا بیج بویا جاتا ہے' دوسرے مذہب کے خلاف' دوسرے تمام مذاہب کے خلاف' ان تمام ان گنت فرقوں کے خلاف جن میں آپ شامل نہیں ہیں۔ محبت کے تمام پرچار کے باوجود اس وقت خود بخود ہماری عقل سلب ہو جاتی ہے اور ہم دنیا کے سب سے مطمئن انسان بن جاتے ہیں۔ تمہیں پتا ہے زندگی کا سب سے تسکین بخش جذبہ کون سا ہے؟ حماقت کا! احمق بن کر' زندگی کی بنیادی ضرورت کے متعلق سوچنا چھوڑ کر ہم اتنی تسکین حاصل کرتے ہیں جتنی مالکونس راگ سن کر بھی نہیں کرتے۔ مگر اطمینان کہاں ہے؟ اسے کون جانتا ہے؟ ذہن انسانی کے سب سے بڑے کرب آلود سوال کا جواب ہم اپنے بڑے بوڑھوں سے حاصل کر لیتے ہیں۔ کیوں؟ محض اس لیے کہ وہ ہم سب سے زیادہ عمر رسیدہ ہیں؟ ہاں' محض اس لیے!! ہم بڑے بوڑھوں کو اپنا رہنما بنا لیتے ہیں اور ان کے

نقشِ قدم پر چلتے ہیں' محض اس لئے کہ وہ بڑے بوڑھے ہیں' یا اس لئے کہ وہ ہمیں عقل کے استعمال سے نجات دلاتے ہیں۔ ہم نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ وہ کیا ہیں۔ وہ ہم سے بڑے احمق ہیں کیونکہ انہوں نے زندگی بھر حماقت کی ہے اور اس کا علم رکھتے ہیں اور اسے ماننے پر تیار نہیں ہیں' کیونکہ وہ بوڑھے ہو چکے ہیں اور بڑھاپا ہمیں مایوس کر دیتا ہے اور مایوس انسان پرتعصب اور نادار ہوتا ہے۔ میں نے موت کی آمد کو محسوس کیا ہے' اور میں سچ کہتا ہوں نعیم' اپنے آپ کو موت کی طرف پا بجولاں بڑھتے ہوئے پا کر انسان اپنے آپ کو از حد احمق اور بدجو محسوس کرتا ہے کیونکہ موت اس کی شکست ہے اور اس سے پیشتر وہ اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنے کی جان توڑ کوشش کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے لیکن تسلیم نہیں کرتا۔ وہ کبھی تسلیم نہیں کرتا۔" اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "کیا صرف محبت کافی نہیں ہے' نعیم؟ اس گروہ بندی کے بغیر۔ صرف محبت' جو ایک آفاقی جذبہ ہے' کیا ہماری روح کو اس کے علاوہ کسی اور شے کی بھی ضرورت ہے؟ ہم جو سینکڑوں برسوں سے ایک دوسرے کے مذہب کو کوستے آئے ہیں' ایک دوسرے کے خداؤں کو نالائق کہتے آئے ہیں اور اسی سانس میں محبت کا پرچار کرتے رہے ہیں' کیا یہ ہماری کم عقلی ہے؟ نہیں۔ ہم سب جانتے ہیں۔ یہ ہماری وہ مایوسی ہے جو انسان کو ضدی اور کج بحث بنا دیتی ہے۔ ہم کبھی تسلیم نہیں کرتے۔ ہم میں سے ہر ایک قصبوں اور دیہاتوں میں عدالت لگانے والے ان ججوں کی طرح ہے جو جانتے ہیں کہ وہ بوڑھے اور ناکارہ اور بے اثر ہو چکے ہیں لیکن اپنی غلطیوں کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں کیونکہ ہم نے ایک زندگی گزاری ہے اور اس کا کوئی جواز پیش نہیں کر سکتے اور جب ہم اپنے پیروں کے نیچے سے زمین کھسکتی دیکھتے ہیں تو ہماری آخری شکست میں بھی تسکین کی اچھی خاصی صورت نکل آتی ہے۔" وہ پھر خاموشی سے جال پھینکتے ہوئے ملاحوں کے قریب سے گزر رہے تھے۔ چند لمحے تک رکنے کے بعد انیس الرحمان نے پھر اپنے مخصوص انداز میں تیزی اور جوش کے ساتھ بولنا شروع کر دیا: "تمہیں پتا ہے جب سے مذہب کی بنیاد پڑی ہے اسے کتنی بار ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا ہے؟ مذہب ہماری عقل کے راستے سے دل تک پہنچتا ہے اور وہاں اپنا قبضہ جما لیتا ہے۔ اسے کتنی آسانی کے ساتھ مجروح کیا جا سکتا ہے۔ آج تک کتنی جنگیں مذہب کے نام پر ہوئی ہیں' کتنے قحط پڑے ہیں؟ کیا صرف اس لئے کہ مذہب ہمیں محبت کرنا سکھاتا ہے۔ بہہ۔" وہ نعیم کی طرف جھکا۔ "ایک شے ہے عقلِ سلیم۔ کیا اسے بھی مجروح کیا جا سکتا ہے؟ کیا ہم ایسی سوسائٹی نہیں بنا سکتے جس کی بنیاد عقلِ سلیم پر رکھی گئی ہو' جس میں ہم اپنے ہر اچھے برے فعل کے لئے سوچیں اور فیصلہ کریں اور اس کے ذمہ دار ہوں؟ اچھائی اور برائی' غلط اور صحیح کا ایک عالمی معیار ہے جو انسانی عقل کے مطابق ایک سا ہے۔ ایک فعل' ایک قدم' ایک بات اگر اچھی ہے تو وہ مشرق اور مغرب اور شمال اور جنوب میں ہر جگہ اچھی اور درست ہے کیونکہ عقلِ سلیم نے اس کا فیصلہ کیا ہے اور عقلِ سلیم ہم سب میں ایک سی ہے۔ ضرورت مند کی مدد کرنا درست ہے' میرے لئے اور تمہارے لئے اور سب کے لئے' تم اس سے انکار کر سکتے ہو؟ میرے مذہب میں ہمسائے سے محبت کرنا درست ہے' میرے ہمسائے کے مذہب میں ایسا کرنا غلط ہے۔ لیکن میری اور تمہاری اور میرے ہمسائے کی عقلِ سلیم کے مطابق یہ درست ہے اور بالکل درست ہے۔ جب ہر کوئی اپنے اپنے لئے سوچے گا

تو درست ہوگا اور غلط غلط۔ ہم سب' اور' ہم سب' یہ جانتے ہیں کہ باغبانی کرنا درست ہے اور کاہلی اور آرام طلبی نادرست۔ کیا صحیح فعل کے لئے ہمیں کسی اور شے کی ضرورت ہے؟ کیا ہم سب کے لئے میٹھا میٹھا اور کڑوا کڑوا نہیں ہے؟ یہ تو کیوں؟ اس لئے کہ ہماری حس پر کوئی بندش نہیں ہے۔ جب ہماری عقل صحیح سالم ہوگی اور اسے کام میں لایا جائے گا تو ایک فعل کی نوعیت ہم سب کے لئے یکساں ہوگی' اس میں کوئی تضاد نہ ہوگا اور اس سے کبھی ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جا سکے گا۔ اس پر کوئی جنگ نہ ہوگی۔ آج ہماری سوسائٹی میں یہی خلا کافی ہے کہ ہم سوچنے سے معذور ہیں۔ جب ہر کوئی اپنے لئے سوچے گا تو مجلس بھرپور ہوگی' تب کوئی حماقت باقی نہ رہے گی' کوئی شکست باقی نہ رہے گی تب ......'' وہ الفاظ کی تلاش سے ہار کر خاموش ہو گیا۔

''لیکن اس سے...... فائدہ کیا ہوگا؟'' نعیم نے بغور سنتے ہوئے سوال کیا۔

انیس الرحمان کی آنکھوں میں قدیم' قدرتی ذہانت کی چمک عود کر آئی: ''یہی تو ہماری شکست ہے عزیز دوست۔ برسوں بلکہ صدیوں کی ناکارہ تربیت نے ہمارے اندر نفع و نقصان کا ایک تباہ کن احساس پیدا کر دیا ہے اور اس سے بھی زیادہ خوفناک بات یہ ہے کہ یہ احساس انجانے طور پر ہمارے خدا کے ساتھ اور قدرت اور قسمت کے ساتھ وابستہ ہے۔ مجھے تم سے اس سوال کی توقع تھی۔ میں بھی یہی سوال کرتا ہوں۔ میں تم میں سے ہی ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں جواب دینے کی کوشش بھی کرتا ہوں۔ سنو۔ صحیح فعل اپنا فائدہ آپ ہے۔ صحیح اقدام سے ہم ماضی اور مستقبل [illegible] آزاد [illegible] جو بڑے سے بڑے فائدے سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔ اور سب سے خوشگوار بات یہ ہے کہ ہم انصاف کی توقع سے بھی رہائی پا لیتے ہیں۔ انصاف ہمارے یہاں پر ہے۔'' اس نے پھر دو انگلیوں سے سر کو ٹھونکا۔ ''اور ہمارا خدا بھی یہاں پر ہے اور سب کچھ یہیں پر ہے اور یہی فیصلہ ہے۔ اس کے باہر کچھ بھی نہیں ہے۔ صحیح فیصلہ' صحیح قدم۔ صرف اسی فعل میں ہماری نجات ہے۔ یہ لمحہ جس میں ہم زندہ ہیں اس سے ہم تسکین حاصل کرتے ہیں اور مکمل آزادی سے زندہ رہتے ہیں۔ مستقبل' انصاف' فائدہ' نقصان' یہ سب ایک طویل انتظار میں شامل ہیں جو ہم پر ایک عظیم اور لاحاصل خوف طاری کر کے ہمیں احمق اور ناکارہ بنا دیتا ہے۔ جب کوئی انتظار نہیں رہتا کوئی شکست بھی نہیں رہتی۔ کوئی بھی۔''

دونوں کافی دیر تک غیر یقینی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر انیس نے انجن کو گیئر میں ڈالا اور کنارے کی طرف رخ کر لیا۔

جب وہ خاموشی سے پتھروں پر چلتے ہوئے اس جگہ پر پہنچے جہاں سے اٹھ کر گئے تھے تو دونوں بچے بھاگ کر انیس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے اور بلقیس جلدی جلدی اسے بتانے لگی کہ کس طرح ان کے جانے کے بعد دونوں کنڈیوں کو ایک ساتھ مچھلیاں لگ گئی تھیں اور نوکر کو آواز دیتے دیتے نعیم کی چھڑی کی مچھلی کھینچ کر لے گئی اور وہ صرف انیس کی چھڑی کو بچا سکی تھی۔

(۴۲)

''ہم دور دراز کے سفر کرتے ہیں اور ہزاروں لوگوں سے ملتے ہیں اور ان سے تبادلۂ خیالات کرتے ہیں اور ہر ایک سے کرتے ہیں اور کیے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک دن دفعتاً ہمیں احساس ہوتا ہے یہ سب اس قدر بے سود ہے۔'' انیس الرحمان نے تھکی ہوئی آواز میں بات ختم کی اور حقے کی نے منہ میں رکھی جسے اس نے ادھر کچھ عرصے سے شروع کر رکھا تھا۔ نعیم نے خاموشی سے اس کی بات سنی اور دیوار پر لٹکی ہوئی پرانی پینٹنگ کو گھورتا رہا۔

یہ جمنا کے کنارے وسیع آموں کے باغ میں گھری ہوئی ٹھنڈی پُرسکون کوٹھی تھی جس کے ایک آرام دہ روشن کمرے میں وہ دونوں بیٹھے تھے۔ باہر رات پڑ چکی تھی لیکن دریا کے رخ چلنے والی ہوا ابھی تک گرم تھی۔ کوٹھی کی حدود سے پرے فصلیں کی روز ہوئے کاٹی جا چکی تھیں اور کھیتوں میں تازہ تازہ ہل چلا ہوا تھا۔ ایک دو بارشیں بھی ہو چکی تھیں جن سے کھیتوں کی مٹی سیاہ اور چکنی ہوئی تھی اور اساڑھ کی دھوپ میں ان میں سے زمین کی مخصوص مرطوب بو لیے ہوئے بھاری، گرم بخارات نکلتے رہتے تھے۔ کوٹھی کے باغ میں آم پک کر ایک ایک کر کے رات بھر گرتے رہتے تھے اور سنہری چھلکے کے خوشبودار شہد ایسے میٹھے آموں کا برآمدے میں ڈھیر لگایا جاتا تھا جس پر انیس اور نعیم نے کبھی شوق سے نگاہ بھی نہ ڈالی تھی۔ وہ دو اکتائے ہوئے چہروں اور متجسس آنکھوں والے تھے، جو عمر کے ایک عجیب اتفاق [illegible] اور خاموشی سے ایک دوسرے کے سہارے پر بیٹھے زندگی کو اپنے قریب سے بڑی آزادی اور لاپروائی کے ساتھ گزرتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ زندگی کی بے وقعتی اور انسان کے لاحاصل جذبوں کا جتنا تکلیف دہ احساس ان دو مردوں کو تھا اور عمر نے اپنے پیچھے جو خلا چھوڑا تھا اس کی وسعت کا جو اندازہ ان کو تھا، گئے گزرے زمانوں میں، جب پیغمبر آتے تھے شاید کسی کو رہا ہو۔ ان میں سے کوئی ایک جب زندگی کا تحفہ برداشت نہ کر سکتا تو کوئی بے تکی سی بات کرنے لگتا، پھر اس کے غیر ضروری پن کو محسوس کر کے خود ہی خاموش ہو جاتا۔ زندگی ایک کم عقل اور اوباش نوجوان کی طرح تھی جو بڑھے ہوئے ان لوگوں کے پاس سے لاپروائی اور حقارت کا قہقہہ لگاتا ہوا گزر جاتا ہے۔

اسی طرح انیس الرحمان نے پھر کوئی بات کرنے کو نے الگ کی، لیکن بولے بغیر منہ میں رکھ لی۔

پہلی بار جب نعیم یہاں آیا تھا اس واقعے کو کئی برس گزر چکے تھے۔ اب وہ اس باغ کے چپے چپے سے واقف اور کوٹھی کے کمروں سے مانوس ہو چکا تھا۔ دیواروں پر لٹکی ہوئی قدیم انگلستان کی تصویریں جن میں رنگ برنگے کپڑے پہنے گھڑ سوار وحشی شکاری کتوں کے ہمراہ لومڑ کے شکار کو جاتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ اور قدیم گرجا گھر اور ہندوستانی راجاؤں کی تصویریں، جو اپنے انگریز مہمانوں کے ہمراہ ہاتھی پر سوار ہو کر شیر کے شکار کو جا رہے تھے، اور الماریوں میں رکھی ہوئی شیر، لومڑ اور مچھلی کے شکار کے متعلق بیسیوں کتابیں جنہیں اب کوئی نہ پڑھتا

تھا اور آتشدان پر رکھے ہوئے پتھر اور چینی کے پرانے مجسمے اور ایک تانبے کا مہاتما بدھ۔۔۔ ان تمام چیزوں کے درمیان وہ پرانے باسیوں کی طرح پھرتا تھا اور انیس الرحمان کا گھوڑا اسے دیکھ کر خوشی سے ہنہناتا تھا۔ ان تمام برسوں میں روحانی طور پر وہ شاید انیس الرحمان سے اتنا ہی دور رہا تھا جتنا پہلے روز تھا لیکن اس دوران میں آہستہ آہستہ انیس اس کے لئے ایک قسم کا مادی سہارا بن چکا تھا۔ جو عمر کے اس دور میں تھوڑی بہت طمانیت کا باعث ضرور تھا۔ وہ اس کے لئے عقل، عقلِ اصل اور عقلِ محض کی علامت بن چکا تھا جس کے ساتھ نعیم اپنی مایوسی میں بے طرح چمٹا ہوا تھا۔ اس سے مرعوب اور کسی حد تک خوفزدہ ہو کر چپ رہنا اس درجہ نعیم کی عادت میں داخل ہو چکا تھا کہ اب اس نے اس کی باتوں کو دھیان سے سننا بھی چھوڑ دیا تھا۔ روحانی ابتری کے اس دور میں اسے کبھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ جہاں ڈرنے اور مرعوب ہونے کی اہلیت ہو وہاں محبت کرنے کی اہلیت نہیں رہتی' سچائی کو جاننے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ وہ اب محض اس علامت کے سہارے پر رہ رہا تھا جس کا کہ انیس الرحمان حامل تھا۔

انیس الرحمان میں ان چند برسوں میں بنیادی تبدیلی پیدا ہو رہی تھی۔ اس میں ایک دم بڑھاپے کے آثار نمایاں ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اس کے بال زیادہ تر سفید ہو چکے تھے اور اس کی شخصیت میں اعصابی قوت' جس نے اتنا عرصہ اسے جوان بنائے رکھا تھا' تیزی سے زوال پذیر تھی۔ اب اس نے باتیں کرنا کم کر دی تھیں اور زیادہ سے زیادہ وقت اپنے گھر والوں سے الگ اس کوٹھی میں اکیلا بسر کرنے لگا تھا۔ پہلے اس کے بیوی بچے ہر دوسرے تیسرے باقاعدگی کے [illegible] جاتے اور وہ اکیلا یا صرف نعیم کی معیت میں آ کر پڑا رہتا۔ اس کے باوجود دفتر میں اور گھر کے اندر اس کی کارگزاری میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ وہ اسی مشین کی سی پھرتی اور باقاعدگی کے ساتھ دفتر کے کام کرتا اور گھر کی انتظامی' بچوں کی تعلیم و تربیت اور بیوی کی ضروریات کے سلسلے میں اسی احتیاط اور شدومد سے حصہ لیتا۔ اس کی زندگی میں جو مایوسانہ رنگ آ گیا تھا اسے کبھی نعیم نے شدت سے محسوس نہ کیا تھا کیونکہ اس کے نظریات اس کے لئے مضبوط عادت بن چکے تھے جن کے ساتھ چمٹا رہنا اس کے لئے آسان اور قدرتی عمل تھا۔ یہ اس کی روزمرہ زندگی سے اسی طرح ظاہر ہوتا تھا جیسے کولہو کے گرد مستقل گھومتے رہنے کے نظریہ سے بیلوں کی عقیدت ظاہر ہوتی ہے جو کہ فی الحقیقت محض ایک عادت ہے۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا کہ نعیم نے اپنی اور اس کی طبیعتوں کے تضاد کو کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ وہ اپنی روح کی انکساری اور ذہن کے تکبر کے مقابلے میں انیس الرحمان کے ذہن اور روح دونوں کی رعونت کو کبھی نہ پہچان سکا تھا۔ حتیٰ کہ ایک بار جب انیس نے بیٹھے بیٹھے چونک کر کہا تھا: ''نعیم' زندگی ہمیں کس بے دردی سے ضائع کر دیتی ہے!'' تو بھی نعیم کی سوچ حرکت میں نہ آ سکی اور اس نے اسے محض انیس کی دانائی کی ایک بات کے طور پر لیا تھا۔ کہ وہ عادات جن سے ہم زندگی کی تشکیل کرتے ہیں' اور علامتیں' جن سے اسے قائم رکھنے کی سعی کرتے ہیں' اس قدر پُرفریب اور بے حقیقت ہوتی ہیں۔

جب بادلوں کی آمد کے ساتھ ہوا تیز ہو گئی اور کھڑکیوں کے پردے اڑنے لگے تو انیس نے حقے کی نے

ایک طرف رکھ دی۔

ہم باتیں کرتے ہیں اور باتیں اور باتیں حتیٰ کہ ایک روز بیٹھے بٹھائے ہمیں احساس ہوتا ہے کہ یہ اس قدر بے سود ہے اور یہ احساس بڑا خوفناک ہوتا ہے۔ تمہیں کبھی ہوا ہے؟ اس کے باوجود ہم چلتے جاتے ہیں۔ منزل سے منزل کی طرف' چہرے سے چہرے کی طرف' بات سے بات کی طرف' حتیٰ کہ ہم تھک جاتے ہیں اور اداس ہو جاتے ہیں اور ہمارے دل سے امن غائب ہو جاتا ہے۔ پھر خاموش جنگلوں کی آرزو پیدا ہوتی ہے۔ تمہیں پتا ہے دل میں کسی آرزو کا پیدا ہونا سکون کے کھو جانے کی نشانی ہے؟ آرزو جو کبھی نہ کبھی حسرت بن جاتی ہے۔ خاموش جنگل اور ساتھی کے طور پر ایک گھوڑا یا کتا' اور چمکدار موسم' اور خیال آرائی' تاکہ ہم چلے جائیں چلے جائیں اور بڑی بڑی عظیم مقدس باتوں کے بارے میں سوچیں۔ اس وقت ان بے شمار چھوٹی چھوٹی غیر ضروری باتوں کے لئے ہمارے دل میں نفرت پیدا ہوتی ہے جن میں ہم عمر بھر مصروف رہے اور ہم عظیم فکر کے لئے تڑپتے ہیں جو کبھی ہمارے ذہن میں پیدا نہ ہوئی۔ ایک وقت آتا ہے جب ماضی کی چھوٹی سے چھوٹی بات ہمیں اداس کر دیتی ہے۔ کوئی چہرہ' کوئی نام' کوئی لفظ' کوئی فقرہ' کوئی پرانی دھن جو ہم نے کسی غیر آباد گلی میں سے گزرتے ہوئے دور سے سنی تھی۔ ہم اس بچے کی طرح محسوس کرتے ہیں جو ہر وقت رونے کے لئے تیار رہتا ہے۔

مسلسل ''دراصل ہم تھک چکے ہوتے ہیں اس مستقل تکلف سے جو ہماری زندگی میں در آیا ہے' جو ہمیں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے پر مجبور کرتی ہے' ان محفلوں پر لے جاتی ہے جہاں جا کر ہم کبھی خوش نہیں ہوتے۔ دراصل ہم محض اکتا چکے ہوتے ہیں' عمر بھر سے جو ہم نے جہالت میں بسر کی' وہ گزرے زمانے جو ہم نے ضائع کر دیئے' ہمارے حروف' ہمارے جذبے' ہماری اپنی جوانی اور بڑھاپا جو ہم نے بچوں کی طرح گزارا یا احمقوں کی طرح۔ اس وقت سڑک پر جاتی ہوئی ایک بس بھی ہمیں سارا وقت یاد دلا دیتی ہے کہ ہم ایک گاڑی کی طرح سرگرداں رہے جو اپنی لائنوں پر چلے جاتی ہے' چلے جاتی ہے لائنیں جو اسے لئے جاتی ہیں' پوچھے بغیر' جانے بغیر' پہچانے بغیر' ہمیں ہانکا جاتا ہے' ہم ہنکے جاتے ہیں۔ اپنی خوراک' اپنی باتوں اور اپنے جذبوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے۔ ہماری کتابیں' نوکریاں' بہترین درزیوں کے ہاں کے سلے ہوئے سوٹ جن کا ذکر کرنے سے ہم کبھی نہیں چوکتے' خوشنما رنگوں کی ٹائیاں' ٹوپیاں اور خوشبوئیں جو ہم نے اعلیٰ درجے کی دکانوں سے خریدیں' سب کو کندھے پر لادے' اپنی ساری امارت کو اٹھائے' ہر قسم کے خیال کو قبول کرتے ہوئے...... خیال جو پڑاؤ سے پڑاؤ تک غائب ہو جاتا ہے...... کھاتے' کھاتے اور کھاتے ہوئے' اور باتیں کرتے ہوئے۔ باتیں؟ ان جگہوں کی جو ہم نے دیکھیں' ان چیزوں کی جو ہماری ملکیت ہیں' ہماری رائیں اور قیاس آرائیاں جن کا کوئی وجود نہیں ہوتا' جو کسی کے لئے اہمیت نہیں رکھتیں' ہمارے اپنے لئے بھی نہیں۔ اس کے باوجود انہیں اخلاق اور توجہ کے ساتھ سنا جاتا ہے اور جواب میں جو کچھ کہا جاتا ہے اسے ہم توجہ اور اخلاق کے ساتھ نوٹ کرتے ہیں' انہیں اہمیت دیئے بغیر' ان کی پرواہ کئے بغیر۔ تمہیں پتا ہے دنیا میں ہم کتنی نرمی' کتنے اخلاق' کتنی مکاری سے ایک دوسرے کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ ہم دنیا بھر